ترکی میں تحریکِ احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دورۂ ترکی کے مشاہدات

از: جناب خلیل حامدی صاحب

(۳)

مولانا جلال الدین رومیؒ کی برسی مدرسۂ امام و خطیب سے فارغ ہو کر دوستوں کی معیت میں واپس ہوٹل آیا اور ابھی ہوٹل کے دروازے پر ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ آج مولانا جلال الدین رومیؒ کی برسی ہے اور استنبول کے ایک سینما ہال میں تُرکی کی ایک کلچرل ایسوسی ایشن کی طرف سے اِس موقع پر سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے، مجلس کا آغاز ہونے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے اور مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ مَیں نے پہلے تو اِس پروگرام میں شرکت سے معذرت پیش کر دی لیکن نائف آفندی، پروفیسر عُزیر اور عبدالقادر سیزگین نے بشدّت اِصرار کیا کہ مَیں اِس دعوت کو قبول کر لوں اور کچھ نہ کچھ ضرور اظہارِ خیال کروں۔ مجھے اظہارِ خیال سے تو گریز نہیں تھا۔ صرف یہ اُلجھن تھی کہ جس نوعیت کا یہ اجتماع ہو رہا ہے اور جس تنظیم کے اہتمام میں ہو رہا ہے وہ میرے ذوق اور رُجحانِ طبع کے خلاف ہے۔ مگر دوستوں نے کہا کہ اِس اجتماع میں زیادہ تر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شریک ہوں گے اور مجھے پُوری آزادی ہوگی کہ میں جو بات چاہوں، کہوں۔ اور تو ہر لحاظ سے دوستوں نے مجھے شرکت پر آمادہ کر لیا مگر ابھی ایک اور رکاوٹ درمیان میں حائل تھی۔ وہ یہ تھی کہ اِس پروگرام کا ایک جُز یہ بھی ہے کہ "درویشانِ حضرت مولانا" بربط و نَے کی دُھنوں پر "رقصِ مولوی" کا مظاہرہ کریں گے۔ خاکسار اِس "کلچرل شو" میں شریک ہونے پر دل کو مطمئن نہیں پا رہا تھا مگر بالآخر یہ طے ہوا کہ جب یہ "شو" شروع ہو تو ہم اُٹھ آئیں گے۔

استنبول کے قندیش (GÜNDEŞ) سینما کے وسیع و عریض ہال میں داخل ہوتے تو دیکھا کہ پُورا ہال کھچا کھچ بھر رہا ہے اور مرد و زن کا مخلوط جمِ غفیر موجود ہے۔ اکثریت نوجوان طلبہ اور طالبات کی ہے۔ کالجوں کے اساتذہ بھی شریک ہیں۔ سیاسی جماعتوں سے وابستہ عنصر بھی شریکِ محفل ہے۔ مرد تمام کوٹ اور پتلون سے آراستہ اور عورتیں بلا استثناء اسکرٹ اور منی اسکرٹ میں ملبوس۔ راقم الحروف قدم قدم پر دوستوں کو کوستا رہا کہ کہاں لے کر آ گئے۔ اور وہ برابر

تسلی دیتے رہے کہ کلمۂ حق ایسی ہی جگہوں پر بلند ہونا چاہیے۔

تعلیماتِ رومیؒ کے موضوع پر تقریر اسٹیج سکرٹری نے پروگرام کے افتتاح کا اعلان کیا۔ اور اعلان میں یہ بھی بتادیا کہ اس اجتماع میں مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیرِ جماعت اسلامی پاکستان کے سکرٹری بھی تقریر کریں گے۔ اِس اعلان پر جب تالیاں بجائی گئیں تو میں نے نائف آفندی سے پوچھا کہ حاضرین میں مولانا مودودی کو جاننے والے کتنے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یقیناً ان میں اکثر لوگ مولانا کو جاننے والے ہوں گے۔ الغرض قرآن پاک کی تلاوت کے بغیر ہی پروگرام کی طرح ڈال دی گئی۔ سب سے پہلے استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر آف فلاسفی ڈاکٹر نورالدین صاحب نے مولانا رومیؒ پر ایک متوسط مقالہ پڑھا۔ ماسوائے چند فارسی اشعار کے راقم الحروف تو کچھ سمجھ نہ سکا۔ البتہ ساتھیوں نے اس کی تعریف کی اور اس کے بعد میری باری آگئی۔ ماحول و اجتماع کی نامناسبت اور طبیعت کے انقباض کے باوجود میں نے اظہارِ خیال کی جرأت کر ڈالی۔ مترجم کی وساطت سے سب سے پہلے حاضرین کو میں نے پاکستان کے مسلمانوں کا سلام پہنچایا۔ ترک قوم کو پاکستان اور اہلِ پاکستان سے جو عمیق محبت بلکہ گرویدگی کی حد تک عقیدت ہے اُس کا اثر یہ تھا کہ پاکستان کا نام زبان پر آتے ہی حاضرین نے تالیوں سے ہال کو سر پر اُٹھا لیا اور دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرا بھی کچھ حوصلہ بڑھ گیا۔ اختصار کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ مولانا جلال الدین رومی اگرچہ قونیہ کے ایک بزرگ انسان تھے، مگر اُن کی دعوت اور تعلیم سے پورا عالمِ اسلامی آگاہ ہے۔ پاکستان کا ہر پڑھا لکھا شخص اُن کی عقیدت کا دم بھرتا ہے۔ ان کی کتاب مثنوی دینی مدارس کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ مولانا رومی کا مشن گوشہ نشین قوم تیار کرنا نہیں تھا بلکہ انہوں نے ایشیائے کوچک میں سلجوقیوں کے عہدِ زوال میں آنکھ کھولی تھی اور ایک نبض شناس طبیب کی طرح انہوں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ تاتاریوں کی یلغار کے سامنے سلجوقیوں کی پسپائی کا سبب یہ ہے کہ قوم کے اندر جہاد کی روح مضمحل ہو چکی ہے اور اخلاقی امراض اور دُنیا پرستی کی وبا نے ملّتِ اسلامی کو کھوکھلا بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ مولانا رُوم نے ملّت کو جہاد پر اکسایا اور علما کو سرزنش کی کہ علم کو اکتسابِ دنیا کا ذریعہ بنانے کے بجائے اُسے دین کے تقاضے پُورے کرنے پر صرف کرنا چاہیئے۔ لفظ "جہاد" کا حاضرین نے خوب خیر مقدم کیا اور طویل تالیوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ جذبۂ جہاد ترک قوم کی گھٹی

میں پڑا ہوا ہے جو نہ پہلے کسی کے نکالنے سے نکلا ہے اور نہ آئندہ نکل سکتا ہے ۔

مولانا رومی کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ اگر ہم حضرت رومیؒ کی دعوت و تعلیم کو چند حرفوں میں بیان کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ: مولاناؒ نے انسان کو توجہ دلائی کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے اور اس کائنات میں اُس کا مرتبہ و مقام کیا ہے ؛ انسان نے جب کبھی اس اہم نکتے کو سمجھنے میں غفلت کی ہے تو وہ لازماً دو خرابیوں میں سے ایک نہ ایک خرابی میں مبتلا ہوا ہے۔ وہ انحطاط کی جانب لڑھکا ہے اور یا اُس نے استکبار کا راستہ اختیار کیا ہے ۔ اور ان دونوں صورتوں میں اُس نے اپنی تباہی کا سامان بھی فراہم کیا ہے اور دنیا کی تباہی کا موجب بھی بنا ہے ۔

اوّل الذکر شکل میں انسان اپنے اصل مرتبہ و مقام سے نیچے گرتا ہے ۔ اور دنیا کے اندر اپنا صحیح منصب سمجھنے میں غلطی کرتا ہے ۔ چنانچہ وہ اپنے خالقِ حقیقی کی بندگی کے بجائے وہ ہر دوسری مخلوق کو خالق ٹھیرانے لگتا ہے۔ کبھی آگ کو خدا مانتا ہے، کبھی حجر و شجر کے آگے سربسجود ہوتا ہے اور کبھی اپنے ہی جیسے انسانوں کی خدائی ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ۔ وہ قومی لیڈروں کو خدائی کا درجہ دینے لگتا ہے۔ اُن کے خود ساختہ قوانین کو واجب الاتباع تسلیم کرتا ہے ۔ اُن کی مطلق العنانی کے آگے گھٹنے ٹیکتا ہے ۔ اُن کے مجسّمے تراش تراش کر ہر اہم مقام پر نصب کرتا ہے۔ چونکہ یہ صورتِ حال امرِ واقع کے منافی ہے اس لیے اس سے دنیا کے اندر خرابی کی متعدد صورتیں جنم لیتی ہیں ۔ اِس طرح ثانی الذکر شکل یعنی استکبار کا راستہ بھی غلط اور خلافِ فطرت ہے ۔ اس شکل میں انسان اپنے اصل مقام کو فراموش کر کے اس وہم کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ خود خدا ہے اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا سودا اُس کے دماغ میں سما جاتا ہے ۔ وہ یہ تصور کر بیٹھتا ہے کہ اس کائنات کا میں ہی مالک ہوں ۔ میں آقا ہوں اور دوسرے غلام ۔ میں حاکمِ اعلیٰ ہوں اور دوسرے میری رعایا ۔ میں جو چاہوں قانون بناؤں اور جسے چاہوں ماروں اور جلاؤں ۔ میں وہ ہوں کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ ۔ یہ راستہ بھی غلط نگاہی اور سودائے خام کی ایک ایجاد ہے ۔ اور انسانی زندگی کے لیے سراسر موجبِ لعنت اور باعثِ ذلّت ہے ۔ جہاں اس زعمِ باطل کا آغاز ہوا، فساد اور ہلاکت خیزی نے سر اٹھا لیا ۔

انسان کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ یہ باور کرے کہ نہ وہ خود خالق ہے، نہ بغیر کسی خالق کے خود پیدا ہو گیا ہے، اور نہ خدا کے سوا کوئی دوسری ہستی یہ حیثیت رکھتی ہے کہ اُسے خالق اور معبود مانا جائے اور اُس کے

قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ اللہ کے سوا انسان کا کوئی معبود نہیں ہے، اور اُس کے قانون کے سوا کسی قانون کی بالاتری درست نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے انبیاء کے ذریعہ جو تعلیم انسان کو بھیجی ہے وہی انسانی زندگی کو اور انسانی تہذیب و تمدن کو اعتدال پر قائم رکھ سکتی ہے اور دنیا و آخرت میں انسان کی کامیابی کا فیصلہ کر سکتی ہے یہ ہے مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کا حاصل۔ اور ہم بڑے خوش قسمت ہوں گے اگر ہم نے ان کی اِس تعلیم کو اپنے لیے حرزِ جان بنا لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حاضرین میرے تمام اشارے سمجھ رہے تھے۔ وہ ایک ایک جملے پر دل کھول کر اپنے ردِعمل کا اظہار کر رہے تھے۔ اور خود راقم الحروف بھی محوِ حیرت تھا کہ لادینی نظامِ تعلیم کے اندر تربیت پانے والے یہ نوجوان اور مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا چلتا پھرتا نمونہ پیش کرنے والے یہ مرد و زن اِس حد تک اسلام کے قریب آ رہے ہیں کہ انسانی حاکمیت پر واضح تنقید اور اللہ کی حاکمیت کی صریح دعوت کو نہ صرف سننے کے لیے تیار ہو گئے ہیں بلکہ اُس پر بے پناہ تحسین کا اظہار کر رہے ہیں اور معنی خیز طریقے سے یہ تأثر دے رہے ہیں کہ اب وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ انسان کی خدائی کی بساط لپیٹ جائے گی اور صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی شریعت کا ڈنکا بجے گا۔

ترکوں اور عربوں کا فرق حاضرین کے اُچھلتے ہوئے جذبات کا اندازہ لگا کر مَیں نے اپنی بات کا رُخ بدل دیا اور خالص جذباتی رنگ میں عرض کیا: اَے ترک بھائیو، اَے سلطان محمد الفاتح کے وارثو، حضرت ابو ایوب انصاری کے پڑوسیو، سلطان عبدالحمید ثانی کے جانشینو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقو اور قرآن کے علمبردارو! تم نے ماضی میں جو کردار ادا کیا ہے وہ اسلامی تاریخ کے اندر سنہری حروف میں ثبت ہو چکا ہے۔ اب پھر اللہ کا نام لے کر اٹھو اور عظمتِ رفتہ کو زندہ کر دکھاؤ۔ دنیا کی فصیلیں اور افریقہ و ایشیا کے جبال و صحرا پھر اُسی پرچم کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں جو اسلام کے غلبہ کی علامت تھا۔ ترکوں کے آخری عہد پر بڑی تنقیدیں کی گئی ہیں لیکن تنقید کرنے والوں سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ سلطان عبدالحمید ثانی کے اِس کردار کی کوئی مثال پیش کر سکتا ہے کہ یہودیوں کی طرف سے اُسے دولت کے انبار پیش کیے گئے اور اُن کے عوض اُس سے صرف یہ مطالبہ کیا گیا کہ فلسطین کے اندر یہودیوں کو آباد ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ مگر سلطان نے یہ کہہ کر اس دولت کو ٹھکرا دیا کہ بیت المقدس کی سرزمین کی مٹی کی ایک مٹھی بھی میرے لیے تمہارے تمام انبار ہائے

سیم و زر سے زیادہ قیمتی ہے۔ فلسطین ہمارے آباؤ اجداد نے خون سے خریدا تھا اور ہم سے بھی خون کے عوض ہی خریدا جا سکتا ہے۔ اس کردار کے مقابلے میں دوسرا کردار یہ نظر آ رہا ہے کہ نہ صرف بیت المقدس بلکہ پورا فلسطین یوں یہودیوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ گویا کسی سابقہ احسان کا بدلہ چکانے کے لیے اُسے تحفے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہو۔ مَیں اس موقع پر برملا اپنے اس خیال کا اظہار کیے دیتا ہوں کہ فلسطین کو عرب ہرگز نہیں آزاد کرا سکیں گے۔ بلکہ انشاء اللہ اِسے ترک اور پاکستانی آزاد کرائیں گے۔

سلطان عبدالحمید ثانی کا نام اب ترکوں کے لیے بڑا محبوب نام ہے۔ مَیں نے جب اُن کا ذکر کیا تو اس پر خوب خوب حاضرین نے داد دی۔ اور یہ نکتہ کہ اب فلسطین کو ترک آزاد کرائیں گے اس قدر گرمجوشی کے اظہار کا مرکز بن گیا کہ طورانی ترکوں کی وہ تمام کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں جو ترک ملت کے دلوں میں عربوں کے خلاف نفرت کا بیج بونے کے لیے انہوں نے صرف کی تھیں۔ کیونکہ طورانی قومیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ترکوں کو عربوں کے کسی مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ترک اور عرب دو متضاد حقیقتوں کا نام ہے جو ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ مگر اب ترک نوجوان قبلۂ اوّل، حرمِ ثالث اور سرزمین انبیاء کے ساتھ گہری وابستگی کا مظاہرہ کر رہا ہے اور اسے یہودیوں سے آزاد کرانے کے لیے بیتاب ہے۔

میری مختصر تقریر ختم ہوئی تو اس اجتماع کا آخری پروگرام شروع ہو گیا۔ اور "رقصِ مولوی" کا تماشا تو نہ ہوا البتہ مثنوی کو چند نوجوانوں نے بربط و نے کی آواز پر سنایا۔ محفل کے اختتام پر دوستوں نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ حاضرین کے ظاہر اور باطن میں کتنا فرق نکلا۔ بظاہر اسلام کی بات ان کے آگے کرنا لاحاصل معلوم ہوتا تھا مگر درحقیقت اِن کے ذہن اسلام کے لیے وا ہو رہے ہیں۔ ہال کے اندر ہمارے پرانے دوست عیسیٰ یوسف الپتگین بھی مل گئے۔ موصوف مشرقی ترکستان (جسے اب سنکیانگ کا نام دے دیا گیا ہے) کی حکومت کے چیف سکرٹری رہ چکے ہیں اور چین کے سُرخ استبداد نے جب ترکستانی مسلمانوں پر مظالم توڑے تو یہ ہجرت کر کے ترکی میں پناہ گزین ہو گئے۔ ٹوٹی پھوٹی اردو اور کچھ نہ کچھ انگریزی بول لیتے ہیں۔ اور انٹرنیشنل سنٹر آف ایسٹرن ترکستان کے پریذیڈنٹ ہیں اور مشرقی ترکستان کی آزادی کے لیے کوشاں ہیں۔ مولانا محترم کے ساتھ بڑی محبت وعقیدت رکھتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ مَیں کل ہوٹل میں آکر تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

سیرِ استنبول اجتماع سے فارغ ہو کر سب دوستوں کے ہمراہ واپس ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے نائف آفندی سے کہا کہ میری وجہ سے آپ حضرات کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ میں آپ لوگوں کے نجی مشاغل میں حارج ہو رہا ہوں۔ میری اس ندامت کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ ہم ابھی آپ کو استنبول کی گشت کروانا چاہتے ہیں۔ استنبول کے دن تو بلاشبہ کیف آور ہیں مگر استنبول کی راتیں بھی بڑی روح پرور اور نشاط انگیں ہیں۔ اور خصوصاً رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں استنبول کا منظر دیدنی ہے۔ مسجدیں بقعۂ نور بن رہی ہیں۔ ان میں قرآن خوانی کی محفلیں جم رہی ہیں۔ روحانی مناظر کے علاوہ استنبول کے قدرتی مناظر بھی بڑے دلکش اور دیدہ نواز ہیں۔ احباب کی اس پیش کش کو غنیمت جانا کہ اتفاق سے استنبول کی سیاحت کا یہ موقع میسر آگیا ہے اور وہ بھی رمضان کے بابرکت اور روح پرور مہینے میں۔ مدتوں سے سن رہے تھے کہ ترکی کا رمضان بڑا پُر رونق اور کیف بداماں ہوتا ہے۔ اس بات نے زیارتِ ترکی کی آرزو کو شدید تر کر رکھا تھا اور اب بحسنِ اتفاق یہ آرزو بروئے کار آ رہی ہے۔ اس خاکسار کی حیثیت کیا ہے۔ دوستوں کے یہ جذباتِ اُلفت و محبت، اور سعادتوں کی یہ بارش صرف مولانا مودودی مدظلہ العالی سے نسبت کی وجہ سے ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

استنبول میں داخل ہونے سے قبل اس کا مجموعی نقشہ سمجھ لیں تاکہ اس تاریخی شہر کی مرکزی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ استنبول کی تفریح گاہوں اور ساحلی مقامات سے کوئی تعرض نہیں، نہ اس کے چشمے اور خیابان ہمارے لیے وجہِ کشش ہیں، اور نہ اس کے کوچہ و بازار موضوعِ سخن۔ کہا جاتا ہے استنبول "موطن العجائب" ہے۔ "عروس المشرق" ہے، تحفۂ فطرت ہے۔ حجاز کی شاہراہوں پر یہ فقرے جگہ جگہ پبلسٹی بورڈوں پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ بے شک یہ درست ہے۔ استعماری اقوام اس کے جمالِ طبعی اور سحر طرازی پر ہمیشہ رال ٹپکاتی رہی ہیں۔ عام سیّاح بھی استنبول کی پُرکیف تفریحات اور وہاں کے سنبل و ریحان اور سمندر کی امواجِ پیچاں کو مرکزِ نگاہ بناتے ہیں۔ خود ترکی کے ادارہ ہائے سیاحت بھی دنیا کو یہی دعوت دیتے ہیں کہ حسین خوابوں کی تعبیر کے لیے استنبول کا مشاہدہ کیا جائے۔

مگر ہماری نگاہِ جستجو جس بات کی ٹوہ میں تھی وہ یہ کہ جو شہر پہلے بازنطینی کلیسا کی راجدھانی تھا اور پھر اسے اسلامی خلافت کا مرکز بننے کی سعادت ملی اور وہ تقریباً ۵ سو سال تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کا آشیانہ بنا رہا، اب وہ اپنی اس پچھلی تاریخ کی کس حد تک نمائندگی کر رہا ہے؟ خاتمۂ خلافت اور لادینی استبداد کے تسلط نے اس کے رنگ

ڈھنگ میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے۔ اور کیا اب ہم یہ توقع باندھ سکتے ہیں کہ آئندہ پھر کبھی یہ شہر اسلام کا ناقابلِ شکست حصار بن جائے اور کوئی نیا محمد الفاتح اٹھ کر ملحدانہ تہذیب کی حکمرانی کے بجائے اس پر اسلامی تہذیب کا سکہ رواں کر دے؟

استنبول کی جغرافیائی اہمیت | استنبول کی جغرافیائی ساخت بڑی دلچسپ ہے۔ بنیادی طور پر یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک ایشیائی حصہ اور دوسرا یورپی حصہ۔ ان دونوں حصوں کو آبنائے باسفورس باہم جُدا کرتی ہے۔ آبنائے باسفورس کا شمالی سرا بحرِ اسود سے ملتا ہے اور جنوبی سرا بحرِ مرمرا سے۔ آبنائے باسفورس کی کل لمبائی ۲۶ میل ہے اور چوڑائی کسی مقام پر ۵ میل تک پہنچی ہوئی ہے اور کسی مقام پر صرف ایک میل۔ شمال سے جو جہاز بحرِ اسود سے نکل کر آبنائے باسفورس میں داخل ہوگا وہ استنبول کے دونوں حصوں کے بیچوں بیچ آبنائے باسفورس کو چیرتا ہوا جنوب میں بحرِ مرمرا کے پانی میں اتر جائے گا اور بحرِ مرمرا کو عبور کرتا ہوا درۂ دانیال سے نکل کر بحرِ ایجین کے سینہ پر سوار ہو جائے گا۔ بحرِ ایجین سے بحرِ ابیض میں داخل ہونے کے لیے اُسے لازماً درۂ دانیال سے گزرنا پڑے گا۔ اس طرح بحرِ اسود سے بحرِ ابیض میں جانے کے لیے ہر جہاز کو پہلے آبنائے باسفورس سے گزرنے کی اجازت لینی پڑے گی، کیونکہ اگر استنبول اُسے پروانۂ راہداری نہیں دے گا تو وہ کسی طور آبنائے باسفورس سے نہیں گزر سکتا۔ اور اس کے بعد درۂ دانیال بھی ایسی تنگ آبنائے ہے کہ حکومتِ ترکی سے باقاعدہ اجازت لیے بغیر وہاں سے بھی عبور محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کا بحری بیڑا صدیوں سے بحرِ اسود کے ٹھنڈے پانیوں سے نکل کر بحرِ ابیض کے گرم پانیوں میں اشنان کرنے کے لیے غلطاں و پیچاں رہا، مگر ترکوں نے اُسے گزرنے کی کبھی اجازت نہ دی۔ اور اب ترکی تاریخ میں پہلی مرتبہ عرب و اسرائیل کی جنگ جون ۶۷ء میں روسی بحری بیڑے نے گرم پانیوں کا مزہ چکھا ہے۔ یہ ترکی حکومت کا بہت بڑا اقدام ہے کہ اُس نے جس بیڑے کو صدیوں تک یہاں سے گزرنے کی اجازت نہ دی بالآخر اُسے عربوں کے مفاد کی خاطر اپنی تاریخی عداوت اور ناقابلِ تغیر روایت کو تج دینا پڑا۔ اس کی تہ میں صرف اسلامی اخوت کا محرک کام کر رہا ہے۔ ورنہ ترک قومیت اور عرب قومیت کے درمیان جنگِ عظیم اوّل میں جو منافرت پیدا ہو چکا تھا وہ اس قدر شدید تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتے تھے مگر یہ دونوں قومیتیں باہم مصافحہ نہیں کر سکتی تھیں۔

ایشیا اور یورپ کا نقطۂ اتصال | یُوں آبنائے باسفورس بحرِ اسود اور بحرِ ابیض کا درمیانی واسطہ بھی ہے اور ایشیا

اور یورپ کے مابین حلقۂ اتصال بھی۔ ترکی کا جو علاقہ ایشیا میں ہے وہ اناضول یا اناطولیہ کہلاتا ہے اور جو ایشیا میں ہے اُسے رومیلی بھی کہتے ہیں اور ترافیا (THRACE) بھی۔ تمام دنیا کے شہروں میں استنبول کی یہ نرالی شان ہے کہ اُس کی نصف آبادی ایشیا میں رہتی ہے اور نصف یورپ میں۔ استنبول یورپ اور ایشیا کا جغرافیائی پل ہی نہیں ہے بلکہ دونوں برِاعظموں کے درمیان تہذیبی، تمدّنی اور تاریخی پل بھی ہے۔ استنبول کا یورپی حصّہ بھی جنوبی سمت میں دو حصّوں میں بٹ جاتا ہے۔ ان دونوں حصّوں کے درمیان آبنائے باسفورس کے بطن سے نکلی ہوئی ایک خلیج ۵ میل تک اندر چلی گئی ہے۔ ترک اِس خلیج کو شاخِ زریں (گولڈن ہارن) کا نام دیتے ہیں۔ اِس خلیج پر دو پل قائم ہیں جن سے عام آبادی صبح و شام اِدھر سے اُدھر منتقل ہوتی رہتی ہے اور کسی سے عبور کرنے کا ٹیکس نہیں لیا جاتا۔ ان میں سے ایک پل رات کو اٹھا دیا جاتا ہے تاکہ جہاز گزر سکیں۔ دوسرا پل سلطان عبدالحمید ثانی نے بنوایا تھا۔ اُس نے اسے نہایت کشادہ رکھا۔ اس پر لوگوں نے سلطان کو غلط اندیش کہا۔ مگر اب آبادی کے ہجوم اور ٹریفک کے اژدحام نے خود یہ ثابت کر دیا ہے کہ سلطان دُور اندیش تھا۔ اگر اتنا کشادہ پل نہ بناتا تو وہ موجودہ ٹریفک کا ہرگز متحمل نہ ہوتا۔ یورپی حصّے کے دونوں منطقوں کے الگ الگ نام ہیں۔ ایک کا نام فاتح ہے جو جنوب میں ہے۔ اور محمد الفاتح کے نام منسوب ہے۔ آیا صوفیہ اسی میں واقع ہے۔ اور دوسرے کا نام بیوغلو ہے۔ یہ بھی بہت قدیم نام ہے جو درحقیقت اس منطقے کے ایک بڑے محلّے کا نام تھا۔ اور پورے منطقے کو بھی اسی نام سے موسوم کر دیا گیا۔ استنبول کے ایشیائی حصے کو اسکودار یا قاضی کوئی کہتے ہیں۔ دونوں پرانے تاریخی نام ہیں۔ یہ تینوں حصے (ایشیائی حصّہ اور یورپی حصّہ کے دونوں منطقے) اب استنبول کہلاتے ہیں۔ ورنہ ماضی میں یورپی حصّہ الگ شہر تھا، اور اُسے قسطنطنیہ کہا جاتا تھا اور ایشیائی حصّہ اسکودار تھا۔ عثمانی سلطان بایزید اوّل یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) نے جب پہلی مرتبہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تو اُس وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا۔ اور جب محمد الفاتح نے ۱۴۵۳ء میں اس شہر کو پوری طرح زیرنگین کیا تو زبانِ خلق نے اُسے اختراعاً اسلامبول پکارا، یعنی اسلام کی عظمت و کثرت کا نشان۔

استنبول کی تاریخ پر ایک نظر عثمانی سلاطین کے جو کارنامے تاریخ نے سنہری قلم سے لکھے ہیں ان میں سرِفہرست یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے ۱۴۵۳ء میں بازنطینی سلطنت کے اس مرکز کو فتح کر کے قلمروِ اسلام کا ایک جزء بنا دیا۔ اور پھر یہاں سے یورپ میں اسلام کا داخلہ شروع ہو گیا، اور ویانا کی فصیلوں نے پرچمِ اسلام کو بوسہ دیا۔

قسطنطنیہ کی بنیاد بازنطیم (BYZANTIUNM) کے نام سے ۶۵۸ قبل مسیح رکھی گئی۔ اس کے بانی اوّل کا نام بیزاس بتایا جاتا ہے جو ان یونانی اقوام کا ایک بادشاہ تھا جو ۶۵۸ قبل مسیح میں یہاں آکر آباد ہوئی تھیں۔ بادشاہ مارکس اور ہلیوبس کے عہد میں اس شہر کا نام اُس کے نانا انطونیون کے نام پر رکھ دیا گیا۔ بعد میں انطونیون سے بدل کر بیوزنطا اس کا نام پڑا۔ اور آخر کار ۳۳۰ء میں رومی بادشاہ قسطنطین نے اس شہر کو رومی سلطنت کا پایۂ تخت بنایا اور اسی کے نام پر اِس شہر کا نام قسطنطنیہ مشہور ہوا۔ بادشاہ قسطنطین نے اِس شہر کو روما کے طرز پر تعمیر کرنا چاہا۔ اس کے اردگرد ایک بہت بڑی فصیل کھینچی جس کے بعض حصے اب تک باقی ہیں۔ استنبول کے ہوائی اڈہ سے جو شخص شہر میں داخل ہوگا اِس فصیل کے شکستہ و منہدم حصے اُس کا استقبال کریں گے۔ تھیوڈوسیس کے بعد یہ شہر مشرقی کی رومی امپائر کا پایۂ تخت بنا، یہاں تک کہ ۲۹ رمئی ۱۴۵۳ء کو ۵۳ دنوں کے محاصرہ کے بعد سلطان محمد الفاتح نے اِسے فتح کر لیا اور یہ صلیب کے بجائے ہلال اور تثلیث کے بجائے توحید کا نشان بن گیا۔

اس شہر کے وجود میں آنے کے بعد سلطان محمد الفاتح کے عہد تک انتیس بار اِس کا محاصرہ ہوا لیکن صرف آٹھ مرتبہ حملہ آور فوج اس کے اندر داخل ہو سکی۔ مسلمانوں نے گیارہ بار قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا ہے۔ مُسندِ امام احمد بن حنبلؒ کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لتفتحنّ القسطنطينة ، فلنعم الامير اميرها و لنعم الجيش جيشها ۔ (تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کرلو گے، اس شہر کا امیر بھی خوب ہوگا، اور یہ فاتح فوج بھی خوب ہوگی)۔ نیز بخاری و مسلم اور مسند احمد میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میری امّت کی پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر حملہ آور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اُسے بخش دیا ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس پیشین گوئی کے یقین پر اور اس سعادت و مغفرت کی طلب میں بارہا مسلمان مجاہدین نے اس شہر کا رُخ کیا۔ سب سے پہلے حضرت امیر معاویہ نے ۴۸ھ (۶۶۸ء) میں ایک لشکر قسطنطنیہ روانہ کیا۔ اس میں بہت سے صحابہ کرام نے شرکت فرمائی۔ مثلاً حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت عُبادہ بن صامت، حضرت ابو الدرداء وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ اس کے بعد عہد صحابہؓ میں دو مرتبہ اور محاصرہ کیا گیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانۂ خلافت میں چوتھی مرتبہ مَسلمہ نے ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ پانچواں حملہ اموی خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے عہد میں ۱۲۱ھ (۷۳۹ء) میں ہوا۔ چھٹا عہدِ عباسی کے زمانہ میں ۱۶۴ھ (۷۸۰ء) میں ہارون الرشید کے زیر قیادت ہوا، اور ساتواں ہارون الرشید کے سپہ سالار

عبدالملک نے ۸۲ھ (۷۰۱ء) میں کیا۔ عربوں کے بعد عثمانی ترکوں کی باری آئی۔ پہلے جس عثمانی حکمران نے قسطنطنیہ کی فتح کا عزم کیا وہ سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۲ء) ہے۔ اس سلطان نے دو مرتبہ قسطنطنیہ پر لشکر کشی کی۔ اس کا پہلا محاصرہ سات ماہ تک قائم رہا اور بالآخر قسطنطنیہ کے حاکم مینوئل کے ساتھ سلطان نے دس سال کے لیے صلح کر کے محاصرہ اٹھا لیا۔ اس صلحنامہ میں دوسری متعدد شرائط کے علاوہ سالانہ خراج کی رقم تیس ہزار طلائی کراؤن مقرر ہوئی نیز مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ میں ایک شرعی عدالت قائم کی گئی جس میں سلطان بایزید نے ترکی قاضی مقرر کیا۔ کلیسائے مشرق کے اس مرکز میں ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کی گئی جو اس شہر کی پہلی مسجد کہلاتی ہے اور موجودہ استنبول یونیورسٹی کے قریب ہے۔۔۔ یونان میں فتوحات حاصل کرنے کے بعد سلطان بایزید یلدرم نے قسطنطنیہ پر فوراً قبضہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ سلطان قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا کہ تیمور لشکرِ جرار کے ساتھ ایشیائے کوچک میں داخل ہو گیا اور سلطان بایزید کو محاصرہ اٹھا کر تیمور کے مقابلے پر جانا پڑا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف قسطنطنیہ کی فتح ملتوی ہو گئی بلکہ سلطان بایزید کی شکست سے خود عثمانی سلطنت بھی شدید تباہی سے دوچار ہو گئی۔ اگر تیمور اور بایزید کے درمیان اس وقت تصادم نہ ہوتا تو قسطنطنیہ ۸۰۵ھ (۱۴۰۲ء) ہی میں مسلمانوں کے ہاتھ آجاتا۔ بایزید کی وفات کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ موسیٰ نے یہ مہم پایۂ تکمیل تک پہنچانی چاہی لیکن اپنے بھائی شہزادہ محمد کے ساتھ اس کی نزاع نے فتح قسطنطنیہ کو کھٹائی میں ڈال دیا۔ آخری بار سلطان مراد ثانی نے ۸۲۵ھ (۱۴۲۲ء) میں اس شہر کی فتح کا عزم کیا مگر رومی شہنشاہ نے اظہارِ اطاعت کیا۔ اور سلطان نے اس سے متأثر ہو کر محاصرہ اٹھا لیا۔ غرض سلطان محمد ثانی، جسے بعد میں محمد الفاتح کہا گیا، سے پہلے مجاہدینِ اسلام گیارہ مرتبہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر چکے تھے لیکن کامیابی کا سہرا محمد الفاتح کا منتظر تھا۔ صحابۂ کرام کے مقدس خون نے جس مہم کی طرح ڈالی تھی اُس کا تکملہ اسی نوجوان عثمانی ترک کی تلوار سے صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہونے والا تھا۔ محمد الفاتح نے اسے عثمانی قلمرو کا دارالحکومت بنایا۔ ۴۷۰ سال تک یہ عثمانیوں کا مرکز رہا۔ مگر ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء میں مصطفیٰ کمال نے اس کی یہ حیثیت ختم کر دی اور اس کے بجائے انقرہ کو ترکی کا صدر مقام قرار دے دیا۔

رمضان کا خیر مقدم | پروفیسر عزیز نائلت آفندی اور شیخ یوسف کے ہمراہ استنبول کی سیرِ شبانہ کو نکلے۔ موٹر شیخ یوسف کی تھی۔ خود ہی اسے چلا رہے تھے۔ شیخ یوسف بھی بڑے دلچسپ اور زندہ دل آدمی ہیں۔ پاکستان دیکھ چکے ہیں

بتانے لگے کہ تبلیغی جماعت کے ہمراہ انہوں نے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں گشت کی ہے۔ پاکستانیوں کے اخلاق اور دینداری کے بڑے مداح ہیں۔ دوبارہ پاکستان آنے کا عزم و شوق رکھتے ہیں۔ تجارت پیشہ ہیں تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی دونوں کی محبت سے لبریز ہیں۔

رات کا وقت ہے۔ استنبول کی شاہراہیں قمقموں سے جگمگا رہی ہیں۔ سردی اگرچہ شدید ہے مگر بایں ہمہ بازاروں میں بڑی رونق ہے۔ رمضان المبارک کا عشرۂ آخر ہے۔ خریداری کا عروج ہے۔ عید کی خوشی اور مسرت سے ہر شخص جھوم رہا ہے۔ مسجدوں کے مینار بجلی کے قمقموں سے سج رہے ہیں۔ ہر مسجد بقعۂ نور ہے۔ ہر مسجد میں تلاوت قرآن پاک ہو رہی ہے۔ رات کی مسحور کن فضا میں قرآن کا نغمہ سرمدی دلوں کی دنیا میں عجیب بے خودی پیدا کر رہا ہے۔ ترکوں کی قرآن خوانی ضرب المثل ہے۔ مصری بھی اس میدان میں کم نہیں مگر مصریوں میں تصنع اور ترکوں میں بے ساختگی ہے۔ یہاں مسجد کی تزئین میں ایک نرالی بات دیکھی۔ ہر مسجد کی پیشانی پر قمقموں کا ہالہ بنا ہوا ہے جسے مُحیّا کہتے ہیں۔ یہ خالص عربی لفظ ہے جس کا معنیٰ ہے چہرہ مُہرہ۔ ہر مسجد کا اپنا الگ مُحیّا ہے جو قرآن کی کسی آیت یا حدیث کے کسی ٹکڑے پر مشتمل ہے۔ مثلاً ینی جامع کا مُحیّا یہ ہے کہ "بزرگی و برتری صرف اللہ کے لیے ہے"۔ مسجدوں کی یہ تزئین و تنویر رمضان المبارک کی خوشی کا ایک مظہر ہے۔

بیوغلو کی حالت میں جس علاقہ میں مقیم ہوں یہ یورپی حصّہ کا وہ منطقہ ہے جسے فاتح کہتے ہیں۔ ہم اس منطقہ سے نکل کر غلطہ پل کے ذریعہ خلیج گولڈن ہارن کو عبور کرنے کے بعد دوسرے منطقہ یعنی بیوغلو میں چلے گئے۔ فاتح میں مسجدوں کی کثرت ہے اور بیوغلو میں مسجدیں کم ہیں۔ بیوغلو خوشحال، تجارت پیشہ اور اہلِ ثروت لوگوں کا منطقہ ہے۔ اس منطقہ کا سب سے نامور محلّہ "تقسیم" ہے۔ استنبول کا ہلٹن ہوٹل اسی محلّہ میں ہے جو بیروت کے فینیسا اور سان جارج سے بھی بازی لے گیا ہے۔ جگہ جگہ نشاط گاہیں ہیں۔ استنبول کے ساحل قدرتی حُسن کو دوبالا کرنے کا موجب بھی ہیں اور استنبول کی اخلاقی زندگی کی تباہی کا سب سے بڑا محرک بھی۔ باسفورس، مرمرا اور قرن ذہبی کے سواحل پر ۲۳ نہانے کے مرکز ہیں جو سال بھر رنگا رنگ تفریحی سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں اور ۲۷ وہ "صنم کدے" ہیں جو ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی سبز پوش پہاڑیوں کی چوٹی پر قائم ہیں۔ دنیا بھر کے سیاح یہاں ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اور سیاحت کے پردے میں عشرت و نشاط کی دل کھول کر داد دی جاتی ہے مشرق

کے شہروں میں بیروت اور اسکندریہ کو اسی سیاحت نے تباہ کیا ہے۔ اس میں استنبول بھی پیچھے نہیں ہے۔ بیوغلو میں عورتوں کی گہماگہمی بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ بھی نشاط گاہوں کی کثرت ہے۔ شہری عورتوں کی اکثریت کو منی اسکرٹ میں دیکھا۔ گو مِڈی بلا کی ہے مگر اسکرٹ اُس سے بھی بڑی بلا بن کر نازل ہو چکا ہے۔ اور اس کی خاطر عورت نے ہر تکلیف گوارا کر لی ہے۔ ستم یہ ہے کہ خود مردوں نے سر سے پاؤں تک گرم لباس پہن رکھا ہے۔ مگر عورت کو فیشن کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ امیر الشعراء شوقی بک نے کہا تھا: خدعوها بقولهم حسناء (مردوں نے عورت کو خوبصورت کہہ کہہ کر اسے بیوقوف بنا رکھا ہے۔

یہودی اور دونمہ | بیوغلو کی ساز و سامان سے لبریز دکانوں، بلند و بالا عمارات، کشادہ شاہراہوں، اور ہوٹلوں اور پارکوں کی بہتات اور جگہ جگہ مصطفیٰ کمال کے مجسّموں کو دیکھ کر میں نے ساتھیوں سے پوچھا کہ فاتح کی نسبت بیوغلو میں یہ چکاچوند زیادہ کیوں ہے؟ نائف آفندی نے میرا یہ سوال اپنے دوسرے رفیقوں تک منتقل کیا۔ پروفیسر عُزیر نے بتایا کہ بیوغلو دراصل تجارتی مرکز بھی ہے اور اُونچے سرکاری ملازمین بھی زیادہ تر یہیں رہتے ہیں۔ تجارت پر زیادہ تر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ بنک کاری کا تمام تر نظام اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بڑی بڑی تجارتی نمائش گاہیں جو نظر آ رہی ہیں ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ضرور کسی نہ کسی یہودی یا مرتد کا سرمایہ ہو گا۔ وہ دیکھیے جگمگاتا ہوا بورڈ "عثمانلی بنکاسی" (بنک آف عثمانیہ)۔ یہ یہاں کا سب سے مضبوط بنک ہے اور یہودی سرمائے کا رہینِ منت۔ بیوغلو کی آبادی میں یہ دونوں گروہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہودی تو میری سمجھ میں آ گئے۔ مگر یہ "مرتد" کیا ہوتے ہیں؟ پروفیسر عُزیر سے میں نے اِس کی وضاحت چاہی۔ کہنے لگے جو لوگ لادینیت کے حامی ہیں، اور پسِ پردہ یہودیوں کے ساتھ میل جول رکھتے ہیں ہم انہیں مرتد کہتے ہیں۔ نائف آفندی نے بات کاٹ کر اس نکتے پر اپنی طرف سے مزید روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ترکی میں ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو یہودی الاصل ہے۔ یہ گروہ اپنی مخصوص اغراض و مصالح کے تحت بظاہر مسلمان ہو گیا۔ اس گروہ کے افراد انجمن اتحاد و ترقی کے اندر بھی گھس گئے۔ فوج کے اندر بھی انہوں نے کلیدی آسامیوں پر قبضہ کر لیا۔ عثمانی خلافت کے آخری ایام میں بابِ عالی کے اندر بھی ان کو نفوذ حاصل تھا۔ "ولایاتِ ثلاثہ" اِن کا اصل مرکز تھا۔ ولایاتِ ثلاثہ کا دوسرا نام مقدونیہ ہے اور اس میں تین صوبے شامل ہیں: سلانیک (SELONIK)، مُناستر (MONOSTIR) اور قوصوہ (KOSOYD)

ترکوں کے اندر قومیت کے جراثیم پھیلانے میں اس گروہ کی کوشش کا بڑا گہرا ہاتھ رہا ہے۔ ترک اس گروہ کو دُونما بھی کہتے ہیں۔ مگر اب دُونما کے بجائے مرتد کی اصطلاح رائج ہوگئی ہے۔ نائف آفندی نے اس ضمن میں ترکی کے بعض چوٹی کے لیڈروں کا بھی نام لیا جو اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے یا اس کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہوگئے تھے۔ یہ بات پہلے کسی حد تک مخفی تھی مگر اب عام لوگ اس سے واقف ہوگئے ہیں۔ شام اور لبنان کے اندر جن ترک والیوں نے عربوں کے ساتھ تشدّد برتا تھا ان کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا اور وہ عربوں کو ترکوں سے متنفر کرنے کے لیے یہ حربے اختیار کرتے تھے۔ مثلاً جمال پاشا جو شام کا آخری ترکی گورنر تھا اور اس نے دمشق کے چوراہے میں شامی لیڈروں کو پھانسیاں دی تھیں، یہ شخص دونمہ تھا۔ ترک مسلمان اس سے آج تک براءت کا اظہار کرتے ہیں۔

مرتد کی یہ تشریح میرے لیے نیا انکشاف تو نہ تھی۔ البتہ اس پہلو سے یہ قابلِ لحاظ تھی کہ اب تک ہم نے باہر بیٹھ کر ترکی کی تاریخ حاضر کا جو مطالعہ کیا ہے اور اس سے جو جو اسباب و نتائج اخذ کیے ہیں وہ صحیح ہیں۔ امیر شکیب ارسلان نے اپنی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" میں دونما کی طرف جابجا اشارے کیے ہیں، بلکہ مرحوم نے اُسی زمانے میں اس گروہ کی اصلیت کا پردہ چاک کر دیا تھا جب یہ عربوں اور ترکوں کے درمیان عداوت کے بیج بو رہا تھا۔ اسی طرح مراکش کے ماہنامہ دعوۃ الحق میں بھی چند سال قبل ایک تحقیقی مضمون دونما کی تاریخ پر شائع ہُوا تھا۔ اس مضمون کے لکھنے والے ترکی میں مراکش کے سابق سفیر عبد القادر القادری ہیں۔ انہوں نے بھی دونما کے اسی کردار کو دلائل کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ اور خود ترک علماء اور اہلِ نظر کے حوالوں سے دونما کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ ترکی کے ماضی کو بھی اسی گروہ نے داغدار کیا ہے اور حال کی تصویر بنانے میں بھی اس کا نمایاں کردار ہے۔ ترک مسلمان اب دونما سے اس قدر محتاط ہوگئے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہ سلانیک کا رہنے والا ہے تو سب کے کان کھڑے ہو جائیں گے۔

شیخ یوسف جو قائد قافلہ تھے درمیان میں کہیں کہیں اپنی بات کر دیتے۔ مگر اُن کی گفتگو میں ٹیپ کا بند پاکستان اور ہندوستان ہوتے۔ بار بار وہ پاکستان سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے۔ راستے میں مجھے یہ بھی بتاتے رہتے کہ یہ فلاں عمارت اور یہ فلاں قلعہ ہے۔ مگر رات اپنی تمام رعنائیوں اور ضوپاشیوں کے باوجود کسی نووارد کو اُن بھیدوں سے آگاہ نہیں کرتی جن سے آگاہ کرنا دن کے فرائض میں شامل ہے۔ یہ جامع سلطان احمد ہے۔ یہ جامع سلطان سلیم ہے۔ یہ نیلگوں مسجد ہے۔ یہ حصار رومیلی ہے۔ یہ یہاں کا مشہور قصر توپ کاپی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس وہ مجھے بہت کچھ بتاتے رہے اور بالآخر وہ موٹر کو ایک پہاڑی پر چڑھا کر لے گئے اور کہنے لگے اُتر کر استنبول کا منظر دیکھیں۔ (باقی)